زاہد منیر عامر *

تمثال و تجرید
(واصف علی واصف کی نظم نگاری)

شاعر کا تخلیقی وجدان حقیقت کے ظاہری روپ پر اکتفا نہیں کرتا، ایسا کرنے سے بیان اکہرا اور بات سطحی رہ جاتی ہے چناں چہ وہ اپنے اظہار کے لیے تمثالیں تلاشتا اور تراشتا ہے۔ تمثالوں کی دنیا اتنی ہی وسیع ہے جتنی ہمارے حواس کی دنیا۔ شاعر کا میلانِ طبع باصرہ، لامسہ، شامہ، ذائقہ، سامعہ میں سے حسبِ ذوق حسیات منتخب کر لیتا ہے اور پھر ان کے ذریعے اپنی بات قاری تک پہنچاتا ہے۔ تمثال، معنی کو اُجلا پیرہن پہنانے کا نام ہے، یہ پیرہن بکھرتا ہے تو حسیات رنگوں کی صورت بیان کے آسمان پر پھیل جاتی ہیں، جس سے مطالب کی قوسِ قزح جنم لیتی ہے اور جہانِ معنی جگمگا اُٹھتا ہے۔

واصف علی واصف دراصل انفس و آفاق میں بکھری صداقتوں کو چند لفظوں میں سمو دینے والا فن کار ہے۔ اُس کا کمال انتشار کو ارتکاز میں تبدیل کر دینا ہے۔ واصف کی کتابیں کرن کرن سورج [۱]، دل دریا سمندر [۲]، قطرہ قطرہ قلزم [۳] اور حرف حرف حقیقت [۴] ہمارے اس خیال پر دال ہیں۔ نثرِ اُردو کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اوّل اوّل اسے محمد حسین آزاد نے تخلیقی اور فن کارانہ جملے کا آبِ حیات پلایا، آزاد کے بعد سجاد انصاری نے مطالب کے محشرِ خیال کو چھوٹے جملوں میں سمونے کا ہنر دکھایا۔ یہ دونوں فن کار بنیادی طور پر رومانوی مزاج کے حامل تھے چناں چہ ان کے جملے رومان کی سطح پر تیرتے دکھائی دیتے

ہیں۔ واصف علی واصف کے اختصاریوں میں حیات و کائنات کا شعور چند لفظوں کی قبا زیبِ تن کر کے یوں ظہور کرتا ہے کہ مطالب کے دفتر اس کے سامنے پست ہوجاتے ہیں۔ جو فن کار نثر میں کفایتِ لفظی کے ہنر سے آشنا ہو اور بامعنی مختصر اور پُر کار جملہ لکھنے پر قادر ہو وہ طبعاً شعر سے قریب آجاتا ہے، کفایتِ لفظی شاعری کی ایک صفت ہے۔ بامعنی اور تہ دار بات اگر موزوں پیرائے میں بیان کی جائے تو شعر بن جاتی ہے۔ اس لیے واصف علی واصف جیسے فن کار نے اگر شاعری کی ہے تو اس میں کوئی تعجب نہیں البتہ اگر وہ شعر نہ کہتے تو ضرور تعجب ہوتا۔ ان کی شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں پہلا مجموعہ شب چراغ [5] خود واصف علی واصف نے منتخب و مرتب کر کے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا، دوسرا مجموعہ بھرے بھڑولے [6] ان کے پنجابی کلام پر مشتمل ہے۔ اگرچہ یہ مجموعہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا لیکن اس کا مسودہ وفات سے پہلے وہ خود تیار کر چکے تھے۔ تیسرا شعری مجموعہ شب راز [7] کے نام سے ان کی وفات کے بعد اُن کے اخلاف نے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا۔ یہ مجموعہ اُن کی باقیات اور اُن کے مسترد کردہ کلام سے مملو ہے۔

انھوں نے بیک وقت حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم، دوہے، ہندی کلام میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان تمام جہتوں سے اُن کی شاعری کا مطالعہ ایک وسیع موضوع ہے۔ اس مختصر تحریر میں ہمارے پیشِ نظر واصف علی واصف کی اُردو نظم نگاری کا جائزہ لینا ہے۔ واصف علی واصف نے شب چراغ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ حصے یم بہ یم، سخن در سخن، کرن کرن، تن من اور کلامِ نو ہیں۔ تیسرا حصہ 'کرن کرن' نظموں پر مشتمل ہے جنھیں شاعر نے ''معریٰ نظمیں'' کہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اُردو نظم نے جب پابند ہیئتوں کا لباس اُتارنا چاہا تھا تو اوّل اوّل قافیے کی قید سے رہائی حاصل کی تھی، نظم میں مصرعوں کے ارکان کی تعداد پہلے کی طرح برابر رہی، محض قافیے اور ردیف سے آزادی کے باعث نظم کو 'معریٰ' کہا گیا۔ نظم کی دنیا میں یہ تبدیلی دراصل ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھی، یہ انقلاب آزاد نظم کے رُوپ میں ظہور پذیر ہوا۔ آزاد نظم جسے انگریزی میں non metrical Verse کہا جاتا ہے یعنی ایسا کلام جو عروضی پابندیوں سے آزاد ہو۔ اُردو کی آزاد نظم ردیف، قافیے، تعدادِ ارکان وغیرہ کی قید سے تو آزاد ہوئی، عروض کی پابندی سے آزادی اُس نے گوارا نہ کی۔ اس اعتبار سے آزاد اُردو نظم فرانسیسی کی Vers Libre سے زیادہ قریب ہے جو عروض و آہنگ کی پابندیوں سے آزاد نہیں ہے۔ اُردو آزاد نظم میں مصاریع چھوٹے بڑے ہوسکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن یہ کسی بحر میں کہے جاتے ہیں۔ نثری نظم کی دنیا اس سے

بالکل الگ ہے یہ وہی دنیا ہے جسے بودلیر نے Poe'me En Prose کہا تھا یعنی نثر میں نظم۔ اس شترگربگی پر ہمارے ہاں بہت کچھ کہا جا چکا ہے یہاں بتانا یہ ہے کہ واصف صاحب کی نظمیں معریٰ نظم سے آگے کی شے ہیں، یہ اپنی بنت اور ساخت میں آزاد نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں واصف صاحب کی کچھ مرغوب بحریں استعمال ہوئی ہیں، انھوں نے اگرچہ الگ سے دوہے بھی لکھے ہیں لیکن نظموں کے لیے بھی اُن کا ذوق بالعموم دوہا چھند کی بحر کو چاہتا ہے، مثال کے طور پر اُن کی نظمیں شاہد و مشہود، فیصلہ، صلابت، شہرِ سنگ، رشتہ، فرمائش، پیش کی جاسکتی ہیں جو تمام فعلن فعلن کے آہنگ میں ہیں، اس آہنگ میں تیزی پائی جاتی ہے اور یہ تیزیِ رفتار واصف صاحب کی نظموں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ نظمیں بالعموم مختصر ہیں جیسا کہ آزاد نظم کو ہونا چاہیے، چونکہ واصف صاحب کا مزاج کلاسیکیت کی طرف مائل ہے اور کلاسیکی شاعری میں صدیوں تک غزل اور مثنوی کی حکمرانی رہی ہے۔ شب چراغ کا بڑا حصہ بھی غزل ہی کی ہیئت میں ہے اور غزلیں بھی 'ڈیڑھ جز پر مطلع و مقطع غائب' کی کیفیت سے نا آشنا بہت بھرپور۔ کلاسیکی ہیئتوں سے اس قُرب اور پیوستگی نے اُن کی نظموں کو بھی متاثر کیا ہے۔ یہ اثر دو صورتوں میں ظاہر ہوا ہے، یعنی ہیئت اور تراکیب۔

نظم اوّل و آخر مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی لیکن اس کا مزاج غزل آشنا ہے، مثلاً:

دانۂ گندم گناہِ اوّلیں
دانۂ گندم سفر سوے زمیں [8]

یہاں ہیئت ہی نہیں مضمون بھی کلاسیکی روایت سے منسلک ہے اور نظم اس پُرانے حصار کو توڑ کر نئی دنیاؤں کی طرف نہیں نکل سکی۔ غزل سے وابستگی کا دوسرا اظہار اُن کی نظموں میں پائی جانے والی تراکیب سے ہوتا ہے مثلاً نورِ مجسم، حسنِ مجسم، خالقِ اعظم (شاہد و مشہود) جہانِ نو، کتابِ فطرت (نکتہ) ضمیرِ آدم (تلاش) تضادِ علم و عمل (دیمک) روزِ ازل، یومِ ابد، حیاتِ جاوداں (تکمیل) جہانِ چہار روزہ (تضاد) بدستِ الفاظ نرم و نازک، نشاطِ غم، نقوشِ رنگیں (پرانے کاغذ)۔

بعض اوقات اُن کی نظم کلاسیکی روایت کے زیرِ اثر خطِ مستقیم میں سفر کرتی دکھائی دیتی ہے، جس کی مثال نظم ''فیصلہ'' ہے جس میں خیال کسی انکشاف کے بغیر منطقی انداز میں آگے بڑھتا ہے اور نظم ایک المیے سے دوچار ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ واصف صاحب ایک orator تھے انھوں نے عمر بھر گفتگو کا چراغ روشن رکھا۔ ان کی

شخصیت کا غالب رنگ خطابت تھا، یہ رنگ کہیں کہیں نظموں میں بھی در آیا ہے مثلاً نظم ''شاہد و مشہود'' کا یہ حصہ:

ہر قطرہ قلزم کا مظہر
قلزم کی گہرائی قلزم
قلزم کی پہنائی قلزم
قلزم کی انگڑائی قلزم
طوفاں قلزم، موجیں قلزم
انسانوں کی کثرت قلزم[9]

اس تفصیل کے باوصف متاثر کن بات یہ ہے کہ واصف صاحب کی نظموں میں وہ روشنی موجود ہے جو انھیں روایتی شاعری کے حصار سے نکال کر نظمِ جدید کی وسعتوں سے آشنا کر دیتی ہے۔ نظمِ جدید کی دنیا پرت در پرت معانی کی انکشاف انگیزی کی دنیا ہے۔ لفظوں کی ایک جنبش، ایک خلافِ توقع موڑ ایسے ستارے بکھیر دیتے ہیں جن سے معانی کا آسمان جگمگا اُٹھتا ہے۔

آخر اک دن
اُس نے مجھ سے کہہ ہی ڈالا
مجھ پر بھی اک نظم کہو تم
ایسی نظم
کہ جس میں میرا نام نہ آئے
میں خود آؤں[10]

فیض صاحب نے کہا تھا ''آتے آتے یونہی دم بھر کو رُکی ہوگی بہار / جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے''[11] واصف صاحب کہتے ہیں:

ایک لمحہ ہے بہار
اک خزاں اور دوسری کے درمیاں
مختصر لمحہ..... بہارِ جاوداں کیسے بنے[12]

واصف صاحب نے بہار و خزاں کے اس تضاد کو جنگ و امن اور موت و حیات تک پھیلانے کی سعی

کی ہے، وہ ''تکمیل'' کے زیرِ عنوان ان تضادات کو یوں تحلیل کرتے ہیں:

امن کیا ہے
ایک وقفہ مختصر
ایک جنگ اور دوسری کے درمیاں

....

موت کیا ہے
ایک لمحہ..... مختصر
زندگی اور زندگی کے درمیاں[13]

یہ اقتباسات واصف صاحب کے پُرکار جملوں کی یاد دلاتے ہیں، جن میں وہ زندگی کے بڑے بڑے تضادات کو بڑی سہولت کے ساتھ چند لفظوں میں تحلیل کر دیتے ہیں۔ ان کی ایک نظم کا عنوان بھی تضاد ہے۔

نہ کوئی دیوار تیری رہ میں
نہ میرے رستے میں کچھ رکاوٹ
یہی تقاضا ہے زندگی کا
ہم اپنے اپنے مدار میں ہوں
کہ سارے اپنے حصار میں ہوں[14]

واصف صاحب کہانی سنانے کی بجائے محفل میں دوسروں کو سوال اُٹھانے کی ترغیب دیا کرتے تھے لیکن نظموں کی دنیا میں وہ کہانی سناتے نظر آتے ہیں مثلاً نظم ''رشتہ'' جس میں پہلے دور اُفق پر ایک ستارہ جھلملاتا دکھائی دیتا ہے، شاعر جس کے دل کی آواز سن رہا ہے لیکن شاعر کی آواز اُس تک نہیں پہنچ رہی۔ یہ مستقبل کا ستارہ ہے جو شاعر کے دل میں ماضی کا دریچہ کھول دینے کا باعث بنتا ہے۔ یہ دریچہ کھلتے ہی شاعر اپنی کہانی سنانے پر آمادہ ہو جاتا ہے یہ کہانی بھی کچھ ستاروں کے ابھرنے اور ڈوبنے کی کہانی ہے لیکن آخر میں حضرت یوسفؑ کے خواب کی طرح ایک ستارہ سب ستاروں کو کھا جاتا ہے۔ یہ شاعر کے مستقبل کا روشن ستارہ ہے ملاحظہ ہو:

میرا ماضی.....؟
ایک کہانی..... ایک پہیلی

سندر رُوپ......سنہرے سائے
جگمگ جگمگ کرنے والے
کتنے تارے
ابھرے چمکے ڈوب گئے
ایک ستارہ سب تاروں کو نگل گیا تھا
جانے والے کب لوٹے ہیں......؟
اک اک کر کے ڈوبنے والے
سب تاروں کو......ایک ستارہ......کھا جاتا ہے!
مستقبل کا روشن تارہ [۱۵]

اس طرح نظم ایک دائرہ بناتی محسوس ہوتی ہے، دائرہ بنانے کی یہ کیفیت نظم ''برقاس'' میں بھی پائی جاتی ہے جس میں پہلے شاعر کچھ بصری تمثالیں ابھارتا ہے جن میں چُپ چاپ پیڑ، گنگ مکان اور خاموش فضائیں قاری کے دل پر ہول کی فضا قائم کرتی ہیں، پھر یکا یک آوازوں کا شور برپا ہوتا ہے جس میں شاعر کا ماضی گونجنے لگتا ہے، یہ ماضی:

چیختا ہے مرے کانوں میں بیاباں کی طرح
پھر یکا یک کسی نغمے کی صدا آتی ہے
یہ مرا فرد ا ہے آواز مجھے دیتا ہے
پھر وہی ساکت و جامد ماحول
وہی خاموش فضا
پیڑ چپ چاپ، مکاں گنگ، فضائیں خاموش [۱۶]

یوں نظم اپنا دائرہ مکمل کرتی ہے لیکن اس میں شاعر کا توضیحی انداز درآیا ہے، منقولہ سطور میں ''یہ مرا فردا ہے آواز مجھے دیتا ہے'' کی لائن توضیحی ہے جس سے معانی کی تحدید ہوگئی ہے اگر یکا یک ابھرتا ہوا نغمہ شاعر کے قدموں کو روکنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس میں محض فردا نہیں تمام زمانوں کے امکانات پوشیدہ رہ سکتے تھے۔

واصف صاحب نے بعض معمولی موضوعات سے بڑے مضامین پیدا کیے ہیں جس کی مثال ان کی نظمیں ''دیمک'' اور ''پرانے کاغذ'' ہیں، پرانے کاغذوں پر نظم لکھتے ہوئے شاعر نے انھیں شکستگی کے ایسے مزار قرار دیا ہے جن پر کوئی کتبہ نہیں:

پرانے چہرے، پرانی آنکھیں
ورق پرانے ...... دریدہ تن ہیں
یہی تو خلوت کی انجمن ہیں
نشاطِ غم کے کئی فسانے
سنا رہے ہیں ورق پرانے [۱۷]

نظم ''دیمک'' میں وہ فکر کو دیمک قرار دیتے ہیں جو زندگی کو گھن کی طرح کھائے جاتی ہے، فکر و خیال کی حدتیں شب بھر شاعر کے جسم کو سلگاتی ہیں اور وہ خود گریزی کے عمل میں مبتلا ہو جاتا ہے اُسے فکر کی وادیوں میں اُس عمل کی تلاش ہے جو سرخوشی کا باعث ہو اور اُسے فکر کی دیمک سے بچائے:

کہ فکر ہی زندگی کا گھن ہے
مجھے مرا فکر کھا رہا ہے
مگر میں کیسے نجات پاؤں؟
کہ اب مرا فکر ہی عمل ہے
میں عمر بھر سوچتا رہوں گا
کبھی نہ آزاد ہو سکوں گا
کہ فکر ہی زندگی ہے شاید [۱۸]

واصف صاحب کا بنیادی موضوع وہی ہے جو دنیا کے تمام مذاہب اور تمام زبانوں کے ادب کا موضوع ہے یعنی......انسان۔ ان کا مسئلہ انسانی ضمیر کی بیداری ہے ان کے خیال میں ضمیرِ آدم نے اپنے آپ کو خود ہلاکت میں مبتلا کیا ہے وہ اسے از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے ہیں اُن کی یہ تمنا اُن کی شاعری میں ضمیرِ آدم کی نوحہ گری میں تبدیل ہوگئی ہے اور وہ پکار اٹھے ہیں:

میں نوحہ گر ہوں
ضمیرِ آدم کا نوحہ گر ہوں
سزا ملی ہے ضمیرِ آدم کو خودکشی کی

ضمیرِ آدم!!

تجھے میں کیسے حیات بخشوں

ترا مسیحا......کہاں سے لاؤں؟ ۱۹

حوالہ جات

* پروفیسر اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور۔

۱۔ واصف علی واصف، کرن کرن سورج (لاہور: کاشف پبلی کیشنز جولائی ۱۹۹۹ء)۔

۲۔ ________، دل دریا سمندر (لاہور: خزینۂ علم وادب، طبع پنجم، جون ۱۹۹۸ء)۔

۳۔ ________، قطرہ قطرہ قلزم (لاہور: کاشف پبلی کیشنز، بار ہفتم، اکتوبر ۱۹۹۹ء)۔

۴۔ ________، حرف حرف حقیقت (لاہور: کاشف پبلی کیشنز، طبع دوم، اکتوبر ۱۹۹۵ء)۔

۵۔ ________، شب چراغ (لاہور: کاشف پبلی کیشنز س۔ن)۔

۶۔ ________، بھرے بھڑولے، پنجابی شاعری (لاہور: کاشف پبلی کیشنز، اشاعت دوم، اگست ۱۹۹۵ء)۔

۷۔ ________، شب راز (لاہور: کاشف پبلی کیشنز ۱۹۹۴ء)۔

۸۔ ________، شب چراغ، ص ۲۰۲۔

۹۔ ایضاً، ص ۲۰۰۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۱۹۔

۱۱۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (مصور ایڈیشن لاہور: مکتبہ کارواں، س ن) ص ۱۶۴۔

۱۲۔ واصف علی واصف، شب چراغ، ص ۲۱۰۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۱۱۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔۲۱۶۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۱۸۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۱۴۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۰۷۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۰۴۔

مآخذ

فیضؔ، فیض احمد۔ نسخہ ہائے وفا۔ مصور ایڈیشن۔ لاہور: مکتبہ کارواں، س۔ن۔

واصفؔ، واصف علی۔ کرن کرن سورج۔ لاہور: کاشف پبلی کیشنز، جولائی ۱۹۹۹ء۔

________۔ قطرہ قطرہ قلزم۔ لاہور: کاشف پبلی کیشنز، اکتوبر ۱۹۹۹ء۔

________۔ دل دریا سمندر۔ لاہور: خزینۂ علم وادب، جون ۱۹۹۸ء۔

________۔ بھرے بھڑولے۔ لاہور: کاشف پبلی کیشنز، اگست ۱۹۹۵ء۔

________۔ حرف حرف حقیقت۔ لاہور: کاشف پبلی کیشنز، اکتوبر ۱۹۹۵ء۔

________۔ شب راز۔ لاہور: کاشف پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

________۔ شب چراغ۔ لاہور: کاشف پبلی کیشنز، س۔ن۔